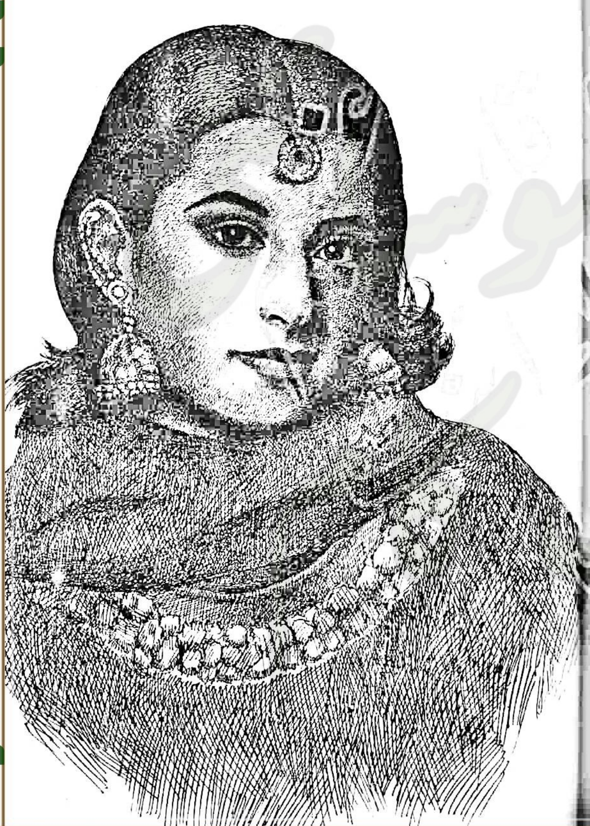
غزالہ نگار اورکزئی

# لمحوں کا روپ





غزالہ نگار اورکزئی

# لمحوں کا روپ

موسم بہار کا تھا۔ درختوں پر بادام، خوبانی اور آڑو کے پھول کھلنے، مہکنے لگے تھے۔ پہاڑوں کی برف پگھلنے لگی تھی۔

اور انہی دنوں بہار کی چھٹیوں میں گھر آئے ہوئے مسمی ارباب جاوید الزماں مختلف اوقات میں سرد و گرم آہیں بھرتے پائے گئے تھے۔ کوئی اور بھلا ان کی یہ حرکت کیوں نوٹ کرتا؟ گھر بار میں فارغ تو میں ہی تھی تاکہ آغا جی اپنے کسی دوست کی بیٹی کی شادی کے لیے لاہور گئے ہوئے تھے اور مجھے سارا دن چرنے یا اِدھر اُدھر آوارہ گردی کے سوا کوئی کام نہ تھا۔

اتفاقاً ہی ایک روز دوپہر کے کھانے پر یہ حیرت ناک منظر دیکھا کہ عزیزم جاوید نے تین کے بجائے فقط ڈیڑھ روٹی پر اکتفا کیا۔ پانی کا گلاس اٹھایا اور کھڑکی سے باہر خلاؤں کو گھورتے ہوئے سرد آہ بھری اور پانی پی کر پیچھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے کیا؟" میں نے پلٹ کر پوچھا۔

"آہ۔ شمیرا کو سخت زکام ہو رہا ہے اور گل مہر کے سر میں بھی درد ہے۔" آہ بھر کر بے نیازی سے جواب ملا۔

جاوید کی ذہنی سطح تو خیر چونکانے والی بات نہ تھی۔ البتہ جس انداز میں خلا کی وسعتوں کو ناپا جا رہا تھا، وہ ضرور تشویشناک بات تھی۔

دسترخوانِ پر پورے خاندان کی موجودگی میں پوچھ کچھ ممکن نہ تھی۔ ادھر دادی صاحبہ یعنی امیّ نے بھی ذرا سا شوربہ چھلک جانے پر مجھ غریب پر صلواتوں کی بوچھاڑ کر دی۔ چنانچہ اس وقت بات آئی گئی ہو گئی۔

پر دوپہر کو جب سب سو گئے تو جاوید الزماں پھر حجرے کے لان میں ٹہلتے اپنے تازہ مشغلے میں منہمک نظر آئے۔

سخت حیرت ہوئی کہ یہ حضرت میدانِ جنگ میں بھی ہوں تو دوپہر کو سونا لازم سمجھتے ہیں اور یہاں تو فی الحال امن ہی تھا۔

اپنے دریچے میں بیٹھ کر جو حجرے کی طرف کھلتا ہے، صدا لگائی۔ "اے نوجوان آخر مسئلہ کیا ہے؟"

نوجوان نے اپنی لمبی گردن موڑ کر مجھے گھورا اور زیر لب بڑبڑایا۔ (یقیناً کچھ گستاخانہ الفاظ ہوں گے) پھر نہایت رکھائی سے بولا۔ "مائنڈ یور اون ڈیمڈ بزنس۔"

سخت غصہ آیا۔ تڑخ کر بولی۔ "مائی ڈیمڈ بزنس از یو جاوید ارباب! آخر تم کیاریوں کو کیوں روند رہے ہو عشق میں مبتلا ہونے کے بعد؟" ضرب کاری تھی نا۔ ارباب جاوید رکے۔ بجلی کی سی تیزی سے مڑے اور چیتے کی طرح لپکے میرے دریچے کی طرف۔ پہلی چھلانگ لگائی۔ دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا۔ بری طرح گرے۔ ہمت نہ ہاری۔ کپڑے جھاڑ کر پھر اچھلے اور




www.paksociety.com

بالآخر لٹکنے میں کامیاب ہوگئے۔ اب ہوائی قلا بازی لگائی گئی اور دوسرے لمحے میرے پاس بیٹھے ہانپ رہے تھے۔ میں نے لاپروائی سے "راسپوتین" گانا شروع کردیا۔

"اللہ کی قسم گُستہ! تو تو ولی ہے ولی۔ دلوں کا حال جان لیتی ہے۔" انہوں نے خلافِ معمول میری اور گدھے کی آواز کا موازنہ کرنے اور مجھے قتل کرنے کی دھمکی دینے کے بجائے بڑے صدق سے فرمایا۔

میں زندگی میں پہلی بار ان کا یہ مدبرانہ 'مصالحانہ اور فقیرانہ انداز بس دیکھتی رہ گئی۔ یعنی اندھیرے میں چلایا ہوا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا تھا۔

"ہائیں' تو کیا تمہیں بھی سچ مچ کیوپڈ نے شہید کر ڈالا؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"جو بھی کچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے۔" تقریباً" رو کر اثبات میں جواب دیا۔

"اے میرے ساڑھے انیس سال کے چچازاد بھائی! ہوش کے ناخن لے۔ یہ تیری عشق کرنے کی عمر ہے یا بی ایس سی میں پاس ہونے کی۔" میں نے اسے لتاڑا۔

"اے پونے پچیس سال کی پہنچی ہوئی بہن! اس بار میں ضرور فیل ہوں گا۔" نہایت وثوق سے جواب ملا۔

"اور پھر آغاجی کے جوتے کھائے گا اور جان آغا (چچا زمان) کی جھڑکیاں سنے گا اور گوشہ نشین ہوگا۔

تاوقتیکہ پاس نہ ہوجائے۔" میں نے اسے مستقبل کی ہلکی سی جھلک دکھائی۔

سامنے گیٹ سے عالیشان کی کار داخل ہوئی اور سمندر نے گیٹ بند کرتے ہوئے حیرانی سے ہمیں دیکھا۔

عالیشان بریف کیس سمیت کار سے برآمد ہوئے۔ "کیا یہ دو شریف لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے؟" انہوں نے ہم دونوں کو دریچے کے چھجے پہ بیٹھے دیکھ کر تیوری چڑھائی۔

"نہیں تو' ویسے آپ ہم دونوں میں سے کس کو شریف سمجھ رہے ہیں؟" میں نے معصومیت سے کہا۔

عالیشان نے مجھے گھور کر دیکھا اور اندر چلے گئے۔

"ضرور کوئی سازشی کھچڑی پک رہی ہے۔" "بسیرا" کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے شہباز نے مشتبہ آواز میں کہا۔ وہ کبھی دوپہر کو اس لیے نہیں سوتا تاکہ سازشی کھچڑیوں کی بو سونگھ سکے۔

"بہت اچھے' تم گھی گرم کرو' بعد میں کھچڑی پر ڈال کر کھائیں گے۔"

جاوید چڑ کر بولا۔ "گُستہ پیاری! چلو اندر چل کر بات کریں۔ دشمنوں کو تو ہماری دوستی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔" جاوید نے آخری جملہ شہباز کو سنانے کے لیے زور سے کہا جس نے بھنا کر کھڑکی ہی بند کردی۔

"پیارے جاوید! اندر سر درد کی ماری گل مہر سو رہی ہے' اس لیے یہ خیال بھی دل سے نکال دو۔" میں نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ جاوید' گل مہر کو کوسنے لگا۔

"ویسے جاوید! یقین کرنے والی بات تو نہیں کہ تم جیسی الٹی کھوپڑی کا جنگجو شخص بقائمی ہوش و حواس عشق میں مبتلا ہو۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ تمہیں مجھ میں کس چیز کی کمی نظر آتی ہے؟ دو آنکھوں کی؟ دو کانوں کی؟ ایک ناک کی؟ یا ایک دل کی؟" جاوید دوچار گالیاں زیرِ لب دینے کے بعد بگڑ کر بولا۔

"بھئی اور سارے اعضاء شریک ہوں تو ہوں۔ ناک کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔" میں نے اختلاف کیا۔

"بکومت اور مجھے بتاؤ' میں کیا کروں؟" جاوید اپنی اصلیت پر اتر آیا۔ یعنی زندگی میں اس نے کوئی کام کسی کی مدد کے بغیر کیا تھا جو عشق بغیر مدد کے کرتا۔

"کھانا پینا مزید کم کردو' آہیں زیادہ بھرو۔ تارے گننا بھی مفید ثابت ہوسکتا ہے۔" میں نہایت خلوص سے بولی۔

"کاش میں تمہیں قتل کرسکتا۔" دانت پیس کر حسرت سے کہا گیا۔

"یہ مشورہ میں ہرگز نہیں دے سکتی۔" میں نے



انکار میں سر ہلایا۔

"میں کسی مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں گستہ! میری جان پہ بنی ہوئی ہے' بس میں اس سے شادی کروں گا۔" وہ بچوں کی طرح ٹھنک کر بولا۔

"یا پیر بابا!" میں انتہائے حیرت میں گرتے گرتے بچی۔ پہلی بار احساس ہوا کہ اس مقدمے میں ایک فریق اور بھی ہے۔ یعنی جاوید کی محبوبہ!

"کون ہے وہ؟" میں سنجیدہ ہوگئی۔

"آمنہ درّانی؟" جاوید نے سر جھکالیا۔

اور میں نے سر پکڑ لیا۔ آمنہ درّانی یعنی میجر الفت درّانی کی بہن۔ جلال درّانی کی کزن جو حال ہی میں سینئر کیمبرج کا امتحان دے کر اپنے بھائی کے پاس آئی تھی اور دو تین دفعہ الفت کے ساتھ ہمارے ہاں بھی آئی تھی۔ ابھی پچھلے ہفتے' ثنی غیاث کی بیسویں سالگرہ پہ بھی اس سے ملاقات رہی تھی۔ وہ سولہ سترہ سال کی بے حد پیاری' گڑیا سی لڑکی تھی۔ بے حد سیدھی اور معصوم۔

"گُستہ؟" جاوید نے پریشانی سے میرا گھٹنہ ہلایا۔

"زندہ ہو؟" پوچھا گیا۔

"ارے ہاں' ہوتا ہے شب و روز تماشہ میرے آگے۔" میں مری ہوئی آواز میں بولی۔

"تو پھر کہتی کیا ہو' بیچ اس مسئلے کے؟" وہ پُرامید لہجے میں بولا۔

"یہی کہ تم کزن سارا کی طرح نمبر ایک الو کے پٹھے ہو۔" میں مایوسی سے بولی۔

"ہاؤ ڈیر یو۔" جاوید کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور ایک لمحے کو تو تازہ تازہ عشق بھی اڑنچھو ہوگیا پھر اچانک صاحبزادے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ آہستہ سے بولے۔ ایکسپلین یور سلف گستہ!"

"میں یہ موسمی تبدیلیاں دیکھتا جارہا ہوں۔" "بسیرا" سے شہباز کی آواز آئی۔ ہماری باتوں کی آواز تو اس تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ البتہ اتنی دیر سے بے چارہ دوربین لگائے اپنے محبوب مشغلے' یعنی لپ ریڈنگ میں مصروف تھا اور پھر میری اور جاوید کی زندگی میں پہلی بار امن و سکون سے مل بیٹھنے کی ادا بھی اسے ہرگز پسند نہیں آئی تھی۔

"کھچڑی ابھی تیار نہیں ہوئی۔" میں نے اونچی آواز میں اسے اطلاع دی۔

"آخر یہ کیا گورکھ دھندا ہے گستہ؟ کون کھچڑی مانگ رہا ہے اور کون عشق میں مبتلا ہے؟" اندر سے گل مہر کراہ کر بولی۔

جاوید نے بوکھلا کر میری طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں مہر ڈارلنگ! بس یہ شہباز کھچڑی کے عشق میں مبتلا ہے۔" میں شہباز کو دیکھتے ہوئے چہک کر بولی۔

"چلو گُستہ! پچھلے لان میں چلیں۔ یہاں تو ہمیں کوئی دو گھڑی چین سے بیٹھ کر بات نہیں کرنے دے گا۔" جاوید نے مایوسی سے دوبارہ حجرے میں چھلانگ لگائی اور ٹانگ سہلانے لگا۔

"تم چلو' میں آتی ہوں۔" میں نے اس کا عبرتناک انجام دیکھ کر کودنے کا ارادہ ترک کردیا اور اندر سے ہوتی ہوئی پچھواڑے کی طرف چل دی۔ وہاں اس آدھی دوپہر میں کوئی کیوں ہوتا؟ جبکہ اس کے فرمان کے مطابق۔ چھل پیریاں اور بھتنیاں سرگرداں ہوتی ہیں۔ چنانچہ میں نے اور جاوید نے آرام سے ڈیرا جمالیا۔

اس نے اپنا دل کھول کر میرے سامنے رکھ دیا بلکہ انتہائی خلافِ توقع عالم بے بسی کے مظاہرے کے طور پر دو چار آنسو بھی ٹپکائے جس کے جواب میں' میں آٹھ آٹھ آنسو روئی کہ بھائی کو مصیبت کی گھڑی میں دیکھ کر یہ میرا اخلاقی فرض تھا اور اس دوران اخروٹ کے درخت پر براجمان شہباز دوربین لگائے نہ صرف حیران بلکہ پریشان بھی ہوتا رہا کہ آخر یہ کس قسم کی ملی بھگت ہے جس کی ابتدا ہی میں گریہ وزاری کی جارہی ہے۔

اس کی مداخلت بے جا پر نہ صرف ہمیں سکوت اختیار کرنا پڑا بلکہ ایک بے سروپا کہانی بھی گھڑ کر سنانی پڑی کہ کس طرح جاوید کے فزکس کے استاد کی نانی

گھٹنے کے کینسر میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئی ہیں۔ اور شہباز بھلا اتنا ہی احمق تھا کہ ہماری کہانی پر یقین کر لیتا۔ ہاں یہ ضرور سمجھ گیا کہ اس کھچڑی میں اس کا کوئی حصہ نہیں اور اسے شرافت سے ہمارا پیچھا چھوڑ دینا چاہیے۔

غالباً" میری نصیحتوں کے اثرات ہیں۔ جاوید نے آہیں بھرنا چھوڑ کر غور و فکر سے کام لینا شروع کر دیا پھر اس کی چھٹیاں بھی ختم ہو گئیں اور وہ واپس پشاور چلا گیا۔

میں نے سوچا۔ آنکھ او جھل پہاڑ او جھل۔ اب آمنہ درانی سامنے نہیں ہو گی تو یہ دیوانگی بھی رفو چکر ہو جائے گی۔ ٹین ایج کا عشق ہی کیا؟ ہفتہ بھر میں صاحبزادے بھول چکے ہوں گے۔ وہی ارباب روڈ' صدر روڈ اور گورا بازار ہو گا اور خود سے بیس سال بڑی حسیناؤں کے پیچھے چکردار خواری ہو گی اور پھر آمنہ نے کون سا مستقل یہاں رہنا ہے" کالج میں داخلہ لیا تو چلی جائے گی اور شاید جلد ہی الفت کی بھی ٹرانسفر ہو جائے۔

میجرز کاء کے بیٹے کی سالگرہ میں پتہ چلا کہ آمنہ ستمبر تک یہیں ہے۔ یعنی مزید چار پانچ ماہ یہاں گزریں گے اور میرا دل ہولنے لگا۔ جون میں تو جاوید بھی بی ایس سی کا فائنل امتحان دے کر آنے والا تھا۔

میرا خیال شروع سے ہی غلط نکلا۔ جانے کے ایک ہفتے بعد ہی جاوید کا ساڑھے گیارہ صفحات پر مشتمل پہلا خط میرے نام آیا جس کے سوا گیارہ صفحات پر اسی قاتلِ جاں کا تذکرہ تھا۔

میں حجرے کی طرف کھلنے والے دریچے میں بیٹھی آہیں بھرنے اور اس کا خط پڑھنے میں مصروف تھی۔ جانے کب عالیشان آئے اور نیچے کھڑے مجھے دیکھتے رہے۔ بالآخر کھنکھار کر بولے۔ "گستہ بی بی! اب کون سا نیا چکر چلا رکھا ہے تم نے؟؟"

میں نے چونک کر نیچے دیکھا۔ "مطلب کیا ہے آپ کا؟" چیں بہ جبیں ہو کر بولی۔

"تمہاری اور جیدی کی اس غیر معمولی دوستی کا مطلب کیا لیا جائے آخر؟"

وہ اتنی دور سے جاوید کی تحریر پہچان چکے تھے۔

"پتہ نہیں لوگ ہماری دوستی ہضم نہیں کر رہے۔ آخر پہلی بار سیز فائر ہوا ہے ہمارے درمیان۔" میں آہ بھر کے بولی۔

"اس سے تو مجھے ہر حماقت کی توقع ہے۔ تم سے نہیں' جو دانائے راز بنی پھرتی ہو۔" انہوں نے دوسرے الفاظ میں مجھے خراجِ تحسین پیش کیا۔

حنی بھی آ چکا تھا۔ میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذات کے پلندے کو (جاوید نے خط اپنے پریکٹیکل کی کاپی سے صفحے پھاڑ کر لکھا تھا) غور سے دیکھ کر بولا۔ "یہ تمہاری ممی کا خط نہیں ہو سکتا گستہ!"

دل پر چوٹ لگی۔ "آہ ڈاکٹر عبدالحیٔ! اب ممی کہاں؟ اور خط و کتابت کہاں؟ اب تو وہ ہمیشہ کے لیے اپنے مجازی خدا کو پیاری ہو گئی ہے۔" میں حسرت سے بولی۔

"جاوید کا خط ہے بھئی۔" عالیشان نے انکشاف کیا۔

"جاوید کا۔" حنی چلایا۔ کیونکہ اپنے چھوٹے بھائی کی رگ رگ سے واقف تھا۔

"اس ناخلف نے تو کبھی ماں باپ کو بھی دو حرف نہیں لکھے۔ کجا گستہ کو اتنا لمبا خط لکھے گا۔ یعنی اپنی دشمن نمبر ایک کو' ناممکن۔" اس نے ماننے سے ہی انکار کر دیا۔

"مانو نہ مانو عبدالحیٔ! تمہیں اختیار ہے۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

"ہو ہی نہیں سکتا گستہ بیگم! دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے' تم دونوں کی دوستی۔۔۔ دیوانے کی بڑ ہے۔" وہ بے اعتباری سے سر ہلاتے ہوئے اندر چلا گیا۔

"اے لڑکی! کہیں وہ بھی تو پھسل نہیں پڑا تم پر۔" عالیشان آہستہ سے بولے۔

میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ "میں اس سے چھ سال بڑی ہوں۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔

"یہ پاگل جذبہ عمروں کا پابند نہیں ہوتا گستہ! میں



بھی تو پندرہ سال بڑا تھا تم سے۔" وہ افسردگی سے بولے۔

"وہ اور بات تھی۔" میرا دل اچانک بجھ گیا۔ "جاوید مجھ پر نہیں مرتا۔ آپ مطمئن رہیے۔" میں دریچے سے اندر کمرے میں کود گئی اور وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتے اندر چلے گئے۔

ایک لحظے کے لیے میں نے ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے میں خود کو دیکھا۔ ان سالوں میں مجھ میں تو کوئی انقلاب نہیں آیا تھا' پر عالیشان کے چہرے پر بے شمار لکیریں ابھر آئی تھیں اور بال بھی سفید ہونے لگے تھے۔ میں نے سر جھٹک دیا اور دوبارہ خط پڑھنے لگی۔

حنی نے جاوید کے خط کا ڈنکا بجا ہی دیا۔ بی بی گل اپنے لاڈلے کا خط پڑھنے بھاگی آئیں۔

"وہ تو پرائیویٹ خط ہے بی بی! میں تو کسی کو اس کی ہوا بھی نہ لگنے دوں گی۔" میں نے صاف انکار کر دیا۔

"ہائیں' ایسی کیا بات لکھی ہے اس میں؟" بی بی گل حیران ہو کر بولیں۔

"بس ہے نا کچھ بات۔" میں نے اصرار کیا۔

"پر دیکھوں تو سہی' آخر اس نے پہلی بار خط لکھا ہے۔" بی بی گل نے تکرار کی۔

"بے شک لیکن خط میرے نام ہے۔ پورے گھر کے نہیں۔ میں کیوں دکھاؤں؟" میں نے صاف انکار کر دیا۔

"سخت ڈھیٹ ہے تو گستہ! آغا خود سمجھ لیں گے تجھ سے۔" بی بی گل ناراض ہو کر چلی گئیں۔

شام کو جان آغا بڑے میٹھے لہجے میں بولے۔ "جاوید کا خط آیا ہے گستی!"

"جی ہاں' وہ خیر خیریت سے ہے اور خط میں ہرگز کسی کو نہ دکھاؤں گی۔" میں نے پہلے ہی معاملہ صاف کر دیا۔

"زمان اس بدلحاظ سے تکرار نہ کرنا۔" ارجی چاول صاف کرتے ہوئے تلملا کر بولیں۔

"پتہ تو چلے بھابھی! آخر لڑکے نے خط لکھا کس سلسلے میں ہے؟" جان آغا سوچتے ہوئے بولے۔

"ضرور کوئی بات ہو گی آغا! آخر تم فون کیوں نہیں کرتے اسے؟" بی بی گل فکرمندی سے بولیں۔

"بات کا بتنگڑ بنانا اس کو کہتے ہیں۔" میں پاؤں دھوتے ہوئے اونچی آواز میں بولی۔ سب نے گھور کر مجھے دیکھا۔

"اے لڑکی! بتاتی کیوں نہیں' کیا ہے اس خط میں۔" بی بی کلاں نے مجھے للکارا۔

"یا الٰہی' خط تو بے چارے نے کیا لکھا' سارے گھر کے کان کھڑے ہو گئے۔ آخر کو وہ میرا بھائی ہے کیا ہوا جو اپنے انگریزی کا حل شدہ پرچہ لکھ کر بھیج دیا کہ کتنے سوال صحیح ہیں۔" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"انگریزی کا پرچہ' دکھانا تو مجھے۔" میر آغا لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھے۔

"اسے کہتے ہیں الٹی آنتیں گلے پڑنا۔" میں نے پھر زور سے اپنے آپ سے کہا۔

"پیارے آغا! جاوید نے مجھے اپنی جان کی قسم دی ہے کہ وہ پرچہ کسی کو نہ دکھاؤں کیونکہ آدھے سے زیادہ سوال غلط ہیں۔" میں نے جھوٹ در جھوٹ بول کر بھاگنے ہی میں عافیت سمجھی کہ گستاپو کی مزید پوچھ گچھ سے بچ جاؤں۔ مبادا دودھ کا دودھ' پانی کا پانی ہو جائے اور مفت میں میری کھال اتاری جائے۔

جانِ آغا نے بھی بیٹے کو کوسنا شروع کر دیا تھا جس نے ان کا نام ڈبونے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ یعنی باپ' انگریزی کا ادیب۔ بڑا بھائی حنی انگریزی کا وہ خطیب جس نے خیبر میڈیکل کالج میں اپنی دھاک بٹھا رکھی تھی اور چھوٹا بھائی انگریزی میں فیل۔

خدا معاف کرے۔ اس رات جاوید کو فون پہ بے بھاؤ کی پڑیں اور غریب کو سمجھ ہی نہ آئی کہ یہ گالیاں کس حساب میں پڑ رہی ہیں۔

☼ ☼ ☼

آمنہ درانی ابھی یہیں تھی اور اس نے ہر طرف اپنے پیانو کا سکہ جما دیا تھا۔

آغا جی نے بھی سنا تو دل تھام کر رہ گئے۔ "گستہ! یہ

لڑکی تو آفت کی پر کالہ ہے۔" انہوں نے بے اختیار مجھ سے کہا۔

اس رات ہم کرنل غیاث کے ہاں ڈنر پر مدعو تھے اور آمنہ نے موزارٹ کی ایک سمفنی بجائی تھی۔

"ہاں جی' بے حد آفت کی پر کالہ ہے۔" میں نے اتفاق کیا۔

"بیوقوف' میں نے محاورتاً" کہا تھا۔" آغا جی نے مجھے گھورا۔

"اچھا' میں نے حقیقتاً" سمجھا تھا۔" میں نے سادگی سے کہا۔

آغا جی بڑبڑا کر رہ گئے۔

پھر آمنہ نے آغا جی ہی کی فرمائش پر بیتھوون کی ففتھ سمفنی بجانا شروع کی اور آغا جی ایسے بے قابو ہوئے کہ ٹنی سے دیوار پہ لگا وائلن اتروایا اور آمنہ کے ساتھ بجانے لگے۔

ہم سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

آغا جی کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ آمنہ کے ماتھے پر پسینے کے قطرے پھوٹنے لگے اور پیانو اور وائلن نے ہم سب پر جادو کر دیا۔

ہم سب نے سن رکھا تھا کہ ایک زمانے میں آغا جی بے حد مہارت سے پیانو اور وائلن بجاتے تھے۔ پر پہلے حج کے بعد انہوں نے یہ مشاغل جانے کیوں ترک کر دیے تھے۔ یہ میری پیدائش سے بہت پہلے کی بات تھی۔

پھر بارہا ہم نے آغا جی سے فرمائشیں کیں مگر ایک بار بھی دال نہ گلی۔ ہمیشہ وہ بھول جاتے یا آؤٹ آف پریکٹس ہونے کا بہانہ کر دیتے۔ پر آج اس سولہ سال کی لڑکی نے انہیں تمام خود ساختہ پابندیاں توڑ ڈالنے پر مجبور کر ڈالا تھا۔

وہ موسیقی گونج رہی تھی کہ جرمن بھی کیا بجاتے ہوں گے۔ احساس بھی نہ ہوا کب آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ سامنے بیٹھی شیریں کا چہرہ بھی دھواں دھواں ہو رہا تھا اور پاس بیٹھی گل مہر بھی آنکھیں پونچھ رہی تھی۔

آغا جی تو گویا اس دنیا میں تھے ہی نہیں اور آمنہ بھی زمین پہ کہاں تھی۔

کرنل غیاث کے ڈرائنگ روم میں کائنات کی آواز ابھر رہی تھی۔ پوشیدہ آسمانوں کا ساز گونج رہا تھا اور شاید بیتھوون کی روح بھی اتر آئی ہو برزخ سے۔

آمنہ نے صرف ایک بار سر اٹھا کر آغا جی کو دیکھا پھر اس کی محویت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ دونوں ساز مکمل طور پر ہم آہنگ تھے۔ آدھے گھنٹے سے بھی زیادہ دیر تک ففتھ سمفنی گونجتی رہی اور ہم سب اس کے طلسم میں گرفتار رہے۔ آخر آمنہ نے تھک کر آخری ہاتھ مارا۔ آغا جی نے آنکھیں کھولیں اور ساز خاموش ہو گئے۔ ڈرائنگ روم تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ میں بھاگ کر آغا جی سے لپٹ گئی اور ان کے چہرے پر بوسہ دیا۔

"ارے پاگل رو رہی ہے' میں نے تو تیری بچپن کی خواہش پوری کر دی۔"

آغا جی اس وقت بالکل تازہ دم ہوئے ہنس رہے تھے۔ اچانک وہ آمنہ کی طرف گھومے اور جھک کر اس کی پیشانی چومی۔ "تم نے میری عمر کے پچاس سال کم کر دیے آمنہ!" انہوں نے گرمجوشی سے کہا۔

آمنہ مسکرا دی۔ "میرے لیے یہ اعزاز کم نہیں کہ آپ جیسے ماہر نے مجھے کمپنی دی ارباب صاحب!"

"آغا جی!" آغا جی فوراً" بولے اور یہ شاید پہلا موقعہ تھا کہ آغا جی نے کسی غیر کو انہیں آغا جی کہنے کی اجازت دی تھی۔

میں نے گھوم کر میجر الفت درانی کی طرف دیکھا۔ واہ رے' پتھر کا صنم بھی آنسو پونچھ رہا تھا۔ پر اس کے چہرے پر فخر دمک رہا تھا۔

کسی نے مجھے بری طرح پرے دھکیلا۔ میں چیں بہ جبیں ہو کر گھومی۔ کرنل غیاث' آغا جی کو شانوں سے تھامے کھڑے تھے۔

"ارے سیف! آج تو تو نے کم بخت جوانی کی یاد دلا دی۔" وہ آغا جی کو جھٹکے دے دے کر بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہے تھے۔

"یہ بات مجھے دھکیلے بغیر بھی کہی جا سکتی تھی کرنل صاحب!" میں منہ بنا کر بولی۔

"ہیں؟" کرنل صاحب نے چونک کر میری طرف دیکھا اور ان کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔

آغا جی نے مجھ پر آنکھیں نکالیں۔

"مائنڈ یور مینرز گستہ۔" عالیشان دانت پیس کر سرگوشی میں بولے۔

"نیور مائنڈ۔" میں نے کرنل صاحب سے کہا اور آمنہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

اس ہفتے کے خط میں' میں نے ساری روداد جاوید کو لکھ بھیجی جو آمنہ کو بھولنے پر ہرگز آمادہ نہ تھا اور صرف اپنے امتحانوں کے خاتمے کے انتظار میں تھا کہ کب جان چھوٹے اور وہ اڑ کر یہاں پہنچے۔

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ آمنہ نے ایک ہی ہلے میں آغا جی کو تسخیر کر لیا ہے۔

اور وہ کسی کو ناپسند بھی کیوں ہوتی' اتنی پیاری صورت' اتنی اچھی عادتیں اور پھر ایسی صلاحیتیں۔

"کاش آمنہ بھی میری اولاد میں سے ہوتی۔" ایک صبح کھیتوں میں ٹہلتے ٹہلتے آغا جی نے حسرت سے کہا۔

"تو کیا ہوتا' بڑا موسیقی سیکھنے دیتے نا اسے۔" میں چڑ کر بولی۔

اور حقیقت بھی یہی تھی۔ میں نے اور شمیرا نے گٹار سیکھنے کے لیے کتنا سر مارا تھا۔ پر یہ سنتے ہی ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

"میری نرمی سے ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ گستہ!" انہوں نے بری طرح مجھے گھر کا تھا۔

"اے لو' اب ہمارے خاندان کی لڑکیاں بھی ڈومنیاں بنیں گی۔" امی بھی میری بدقسمتی سے آس پاس موجود تھیں۔

"پر آغا جی! اس میں برائی کیا ہے آخر؟" میں نے تکرار کی۔

"لڑکوں کی اور بات ہے۔ پر ہمارے گھر کی لڑکیوں نے کبھی یہ مشغلے اختیار نہیں کیے۔" آغا جی نے مجھے گھورا تھا۔

"اور سر چڑھاؤ اسے خان! کل کو ناچ سیکھنے کی بھی فرمائش کرے گی۔" امی جل کر بولیں۔

"ہاں نا آغا جی! کتنا شوق ہے کلاسیکل ڈانس سیکھنے کا۔" میری بات کا منہ سے نکلنا تھا کہ آغا جی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' کھینچ کر مجھے سلیپر دے مارا۔ اس کے بعد میں نے یا شمیرا نے کبھی یہ بات کہنے کی ہمت نہ کی تھی۔

اور آج آغا جی کس شان سے فرما رہے تھے۔ کاش آمنہ بھی میری اولاد ہوتی۔

"اس سلیپر کی چوٹ مجھے ابھی تک یاد ہے۔" میں نے آغا جی کو جتلایا۔

"ہاں' کبھی کبھی تم حد سے بڑھ جاتی ہو نا۔ اس لیے دو چار ہاتھ بھی پڑنے چاہئیں تمہیں۔" آغا جی ایک کھیت کی منڈیر پر بیٹھتے ہوئے اطمینان سے بولے۔

"نہ تو اب آمنہ جیسی اولاد کی خواہش کیوں ہو رہی ہے؟" میں ان سے ذرا نیچے بیٹھتے ہوئے بولی۔

"جل گئی ہو کیا؟" آغا جی ہنسے۔

"میں کیوں جلنے لگی بھلا؟" میں نے منہ بنایا۔ "میں تو یہ تجویز پیش کرنے لگی تھی کہ شادی کروا لیں آمنہ کی اپنی کسی اولاد سے پھر آپ کے گھر ہی آ جائے گی۔" میں بظاہر لاپروائی سے بولی لیکن اندر سے دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔

"تجویز تو معقول ہے۔ پر افسوس اس پر عمل نہیں ہو سکتا۔" آغا جی اپنی چھڑی سے پتھر ہٹاتے ہوئے بولے۔

"کیوں نہیں ہو سکتا؟" میں نے جرح کی۔

"کبھی تو تم افلاطون جیسی عقلمند ہو جاتی ہو گستہ! اور کبھی سمندرے جیسی بیوقوف۔" آغا جی چڑ کر بولے۔

"مطلب کیا ہے آپ کا؟" میں اپنا اور سمندرے جیسے گاؤدی کا موازنہ کیوں ہونے دیتی بھلا۔

"ابھی سال بھر تو ہوا ہے جلال کا رشتہ ٹھکرائے اور سارہ کی شادی کو بھی بمشکل چھ ماہ ہوئے ہیں۔ جلال ابھی تک کنوارا ہے اور وہ آمنہ کا کزن ہے۔ وہ لوگ بھولے ہوں گے اس بات کو۔ رشتہ دے دیں گے اپنی بچی کا؟" آغاجی نے وضاحت کی۔

میں جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ "میرا خیال تھا آپ کہیں گے' آمنہ کے مشاغل بھی جلال جیسے ہیں اور آپ اپنی بہویں بھی کم نام لوگوں میں سے نہیں لاتے۔" میں نے آغاجی پر چوٹ کی۔

"کیا میں نے غلط فیصلہ کیا تھا؟" آغاجی تلملا کر بولے۔

"یہ تو مجھے پتہ نہیں لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں سارہ اور جلال بھی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور آج بھی کرتے ہیں اور یہ کہ جاوید' آمنہ کے لیے دیوانہ ہو رہا ہے۔" میں نے سر جھکا کر کہا۔

آغاجی مجھے دیکھتے رہ گئے۔ یہ انکشافات ان کے لیے نئے تھے نا۔

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا گُستہ؟" ان کی آواز جانے کہاں ڈوب گئی تھی۔

"اس سے کوئی فرق پڑ سکتا تھا؟ آپ جلال کے حق میں اپنا فیصلہ بدل لیتے؟" میں نے کہا۔

"شاید نہیں۔" آغاجی کافی دیر بعد سوچ کر بولے۔

"تو پھر آپ یہ سب جان کر کیا کرتے؟" میں نے منہ بنا کر کہا۔

"میں سارہ کو سمجھاتا تو سہی گُستہ! آخر وہ میری اولاد' میرا خون ہے۔" آغاجی دکھی ہونے لگے تھے۔

"آپ کے سمجھائے بنا سارہ سمجھ چکی تھی آغاجی! جب ہی تو اس نے چپ چاپ خسرو سے شادی کر لی۔ شاید اسے لاشعوری طور پر علم ہو گیا تھا کہ ہمارے خاندان میں کسی کو ایسی محبتیں نہیں ملا کرتیں۔" میں نے اداسی سے کہا۔

افق پہ عالیشان کا چہرہ ابھرنے لگا تھا۔ جنہوں نے منیزہ کی اور پھر میری پرستش کی تھی اور ایک کو بھی حاصل نہ کر سکے۔ زرینہ آپا کا چہرہ تھا' جنہوں نے عالیشان کو اپنا زندگی بھر کا ساتھی جان کر پوجا تھا لیکن ان کے بجائے شوکت آفریدی کی ہو گئیں۔ ناہید کا چہرہ تھا جس نے عالیشان کو چاہا لیکن انہیں حاصل کر کے بھی ان کا دل نہ جیت سکی۔ سارہ کا چہرہ تھا جس نے جلال کے سوا خدا سے کچھ نہ مانگا تھا اور پھر اس کا دامن خالی ہی رہا اور میرا اپنا چہرہ تھا جس نے پاتے پاتے اپنا پیار کسی اور کو بخش دیا تھا۔

آغاجی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "تمہارے بارے میں تو میں بے قصور تھا گُستہ! تم نے تو خود ہی عالیشان کو ناہید کے حوالے کر دیا تھا۔"

"میں اپنے لیے نہیں' دوسروں کے لیے افسردہ ہوں آغاجی! جاوید کے ساتھ یہ سب نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کو الفت درّانی سے بات کرنی ہو گی۔ میرے بھائی کی خوشیاں اسے دینا ہوں گی۔" میں نے ضد شروع کر دی۔

"ابھی جاوید بہت چھوٹا ہے گُستہ! اور آمنہ بھی بہت چھوٹی ہے۔" آغاجی آہستہ سے بولے۔

"ٹھیک ہے' آپ سوچتے رہیے۔ آمنہ بھی کھو گئی تو آپ کا کیا جائے گا۔" میں ناراضی سے بولی۔

"میں سوچوں گا گُستہ! مجھے پریشان نہ کرو۔" آغاجی سامنے سے آتے علی خان کو دیکھ کر بولے۔

"کیوں؟ کیا کسی نئی چیز کی فرمائش ہو رہی ہے پھر؟" علی خان نے آغاجی کا آخری جملہ سن لیا تھا۔

"ہاں بیٹا! یہ لڑکی بعض دفعہ بہت مشکل فرمائش کر دیتی ہے۔" آغاجی تھکے ہوئے لہجے میں بولے اور واپس چل پڑے۔

علی خان نے گھور کر مجھے دیکھا۔ "کر لو بیٹا جو کچھ کرنا ہے۔ اللہ نے تمہاری رسّی دراز کی ہوئی ہے۔" وہ چپکے سے بولا اور جوابی حملے سے بچنے کے لیے تیزی سے آغاجی کے ساتھ ہو لیا۔

☆ ☆ ☆

میں جاوید کو باقاعدگی سے تازہ ترین حالات کی رپورٹ بھیجتی رہتی تھی۔ پہلے پہل کی پریشانی اور حیرانی کے بعد گھر والوں نے بھی ہماری خط و کتابت کے بارے میں پیچھا چھوڑ دیا۔ یہی سوچا ہوگا کہ عمر کا تقاضا ہے۔ اب ہم سنجیدہ ہو جائیں۔ آخر کب تک بچپنے والی مار پیٹ چلتی رہے گی۔ جون کے آخر میں جاوید بھی امتحانوں سے فارغ ہو کر آگیا اور پھر آمنہ سے ملاقاتیں بھی ہونے لگیں۔ اس بے چاری کو کیا علم کہ اس کی سہیلیوں شمیرا اور زرینہ کے کزن صاحب ان کے اردگرد کیوں منڈلاتے رہتے ہیں؟ کیوں ان کی تصویریں کھینچنے کو پیش پیش رہتے ہیں؟

جلال اور سارہ والے قصے کے باوجود ہمارے اور الفت کے تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ویسے بھی الفت کی عالیشان اور حسنی سے گاڑھی چھنتی تھی، اس لیے وہ اکثر شام کو بہن کے ساتھ ہمارے ہاں آجاتا تھا۔

دو ہی تو بہن بھائی تھے بیچارے اور دونوں غیر شادی شدہ۔ باپ کی وفات کو دس سال ہو چکے تھے اور ماں کا انتقال دو تین سال قبل ہوا تھا۔ چنانچہ ان دونوں کی یتیمی اور تنہائی پر ترس کھانا ہر کوئی اپنا فرضِ اول سمجھتا تھا۔

پتہ ہی نہ چلا کب آغاجی نے بزرگوں کے سامنے اس رشتے کی تجویز رکھی۔ میں تو امی کو دودھ دینے ان کے کمرے میں گئی تھی۔ دیکھا تو سب ہی بزرگ خواتین اور اکا دکا مرد بزرگ بمعہ ڈاکٹر صاحبان یعنی عالی، حسنی اور علی خان کے، کسی مسئلے پر غور و فکر کر رہے تھے اور امی واویلا کر رہی تھیں۔ "کمال ہے خان! اور گل مہر کا کیا بنے گا آخر؟"

آغاجی غسل خانے میں پیسٹ کر رہے تھے۔

گل مہر کا قصہ یہ تھا کہ ادھر وہ پیدا ہوئیں، ادھر بی بی گل نے انہیں جاوید کے لیے مانگ لیا۔ شروع شروع میں تو دونوں ایک دوسرے کو بڑی میٹھی نگاہوں سے دیکھتے تھے کہ رحمان چاچا ملازمت کے لیے ہمیشہ گھر سے باہر رہے تھے۔ دلکہ کی شادی کے بعد جب چاچا ریٹائر ہو کر مستقل قیام کے لیے گھر واپس آئے تو راز کھلا کہ جاوید بارود ہے تو مہر دیا سلائی۔ میٹھی میٹھی نگاہوں کا جادو ایسا ٹوٹا کہ جاوید جو دلکہ کی شادی تک گل مہر کا پرستار تھا، اب اس کے نام پر لاحول پڑھتا تھا اور گل مہر اس کی نسبت کسی افریقن آدم خور کو بطور شوہر ترجیح دیتی تھی۔

سب ہی کو علم تھا کہ بندوق کی نال پہ بھی یہ شادی ناممکن ہے۔ چنانچہ بی بی گل اور چھوٹی چچی نادے بو کہ شادی کے تیس سال بعد بھی دلہن کہلاتی تھیں، نے یہ خیال دل سے نکال دیا۔ پر امی ہرگز ہرگز آمادہ نہ تھیں اور ان کے آگے بولتا کون؟

"مجھے سمجھانے کی کوشش نہ کرو، آخر گھر کے لڑکے ہی باہر شادیاں کرنے لگے تو گھر کی لڑکیوں کا کیا بنے گا۔" وہ نادے بو کی بات پر جھلا کر بولیں۔

"اچار ڈلے گا۔" میری زبان رک نہ سکی۔

"چپ رہو بدتمیز۔" عالیشان نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے مجھے جھڑکا۔

"امی! آپ کو معلوم نہیں ڈاکٹر کہتے ہیں کہ......" میں نے بات ادھوری چھوڑ کر عالی، حسنی اور علی کی طرف دیکھا۔

حسنی بھی اپنے ناخن کی کھدائی چھوڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔

"کیا کہتے ہیں ڈاکٹر، میں بھی سنوں۔" امی تیزی سے بولیں۔

"ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ کزنز میں شادیاں زیادہ نہیں ہونی چاہئیں۔ بچے ناقص پیدا ہوتے ہیں۔" میں نے تو سیدھی سادی بات کی تھی۔ پر ساری خواتین سناٹے میں آگئیں۔

"اے گستہ! خدا کی مار تجھ پر۔" ارجی دانت پیسنے لگیں۔

میں نے حیران ہو کر سب کی طرف دیکھا۔

"ہے ہے گستہ! غضب خدا کا۔ کس بے شرمی سے



بڑے بھائیوں کے سامنے انکشافات کر رہی ہے اور شادی بیاہ کے معاملات میں تجھے بولنے کو کس نے کہا۔ نکل یہاں سے۔ چل فوراً" بی بی کلاں نے میری خبر لے ڈالی۔

"یہ لڑکی تو روز بروز منہ پھٹ ہوتی جا رہی ہے اور انگریزی تعلیم دلاؤ ان کو۔" امی بھی سر پکڑ کر بڑبڑانے لگیں۔

عالیشان اور حسنی سر جھکا کر ہنسنے لگے تھے۔ ناہید بھی ہاتھ منہ پر رکھے ہنس رہی تھی۔ میں نے بے چارگی سے علی خان اور اسفندیار کی طرف دیکھا۔

"ویسے بات تو اس نے سو فیصد درست کہی ہے۔" علی خان میری ہمدردی میں سنجیدگی سے بولا اور گویا جلتی پہ تیل چھڑک گیا۔

"اے لو، یہ بھی بولے۔" ان کی والدہ ماجدہ یعنی آغا بی بی تاؤ کھا کر بولیں۔

"یہ اٹھارویں صدی تو ہے نہیں کہ حقیقت سے نظریں چرائی جائیں۔" علی جھلا کر بولا۔

"رہنے دو میاں! ہم اٹھارویں صدی کے ہی بھلے۔" ارجی تڑخ کر بولیں۔

"ارے بھئی چپ کرو نا۔ ہاں تو امی! آپ کیا کہہ رہی تھیں مہر اور جاوید کے بارے میں۔" عالیشان نے ہمیں چپ کراتے ہوئے امی سے پوچھا۔

"اے بیٹا! تم ہی انصاف کرو۔" امی نے تقریباً فریاد کرتے ہوئے نئے سرے سے بچپن کی منگنی کی داستان شروع کر دی جس سے عالیشان لاعلم تھے۔ آغاجی بھی غسل خانے سے باہر نکل آئے۔

امی کی کہانی ختم ہوئی تو عالیشان نے ہی پوچھا۔ "جاوید اور مہر کیا کہتے ہیں اس معاملے میں؟"

"وہ تو ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے بھی روادار نہیں۔" میں بے اختیار بول اٹھی۔

اب سب کی برداشت سے باہر ہو گیا۔

"گستہ تو نکلتی ہے یا اٹھوں تیرے لیے۔" بی بی کلاں نے آنکھیں نکالیں۔

اتنا بے عزت ہو کر پھر میں خاک رکتی۔ مجبوراً باہر نکل آئی۔

ہاں جب یہ مجلس ختم ہوئی تو عالی، علی، حسنی، ناہید، اسفندیار سب ہی اس کمرے میں چلے آئے، جہاں ہم ٹی وی پر "دس بونے" جیسا بے ہودہ ڈرامہ دیکھ دیکھ کر بور ہو رہے تھے۔

"مبارک ہو مہر، جاوید! تم دونوں کی منگنی ہمیشہ کے لیے ختم۔" علی نے دروازے سے ہی اعلان کیا۔

"کیا سچ؟" جاوید خوشی سے اچھل پڑا۔

گل مہر نے بھی شمیرا اور علوینہ کی احتجاجی منمناہٹ اور بھنبھناہٹ کو نظرانداز کرتے ہوئے لپک کر ٹی وی بند کر دیا۔ (کیونکہ دونوں بہروز سبزواری کے واری صدقے ہو رہی تھیں) اور پرجوش آواز میں بولی "آؤ آؤ، یوم نجات منائیں۔"

"شبِ نجات۔" اسفندیار نے تصحیح کی۔

"وہی، وہی۔" مہر بے صبری سے بولی۔

اور شاید پہلی مرتبہ جاوید نے بھی مہر سے اتفاق کیا۔

"میں اس خوشی میں تم لوگوں کو حلوہ پکا کر کھلاتی ہوں۔" گل مہر نے پہلی بار کوئی کام خود کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔

"اور میں کافی بنا کر لاتا ہوں۔" جاوید چہکا۔

"واہ واہ... کیا شاندار ٹریٹ ہوگی حلوے اور کافی کی۔" حسنی طنزیہ بولا لیکن جاوید اور گل مہر یہ جا وہ جا۔

"آخر امی نے ہتھیار کیسے ڈالے؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"بھئی آرام سے سمجھایا عالیشان نے اور امی کوئی بچی تو ہیں نہیں کہ صحیح بات نہ سمجھیں۔" اسفندیار بولا۔

"توبہ توبہ... اور یہاں منگنی ٹوٹنے کا کیا جشن منا رہے ہیں دونوں۔ امی کو پتہ چلے تو مہر کی بھی شامت آجائے اور جاوید کو بھی جوتیاں پڑ جائیں۔" ناہید قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

پر امی کو حسنی ان کی نیند کی گولیاں کھلا کر آیا تھا،

اس لیے ان کو کیا پتہ چلتا۔ آغا جی بھی سونے کے لیے جاچکے تھے' اس لیے آدھی رات کو سوجی کی تباہی اور چینی کی بربادی پر فریاد کرنے والی سوائے بی بی کلاں اور بی بی آغا کے کون تھا؟ یوں مہر اور جاوید کی شب نجات اس رات حلوے اور کافی کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔

اگلی شام جو میں نے آغا جی' میر آغا' جان آغا اور اپنے والد آغا خان کو آغا جی کی 1920ء والی بیوک میں بیٹھے دیکھا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ بعد میں میرے شبہات کی تصدیق بھی ہوگئی کہ ڈرائیوری کے فرائض اسفندیار نے ادا کیے تھے اور اسی نے بتایا کہ وہ سب الفت درانی کے ہاں گئے تھے اور اس نے اپنے چچا ڈاکٹر جمال درانی سے بات کرنے تک کی مہلت مانگی تھی جو ماں باپ کے بعد دونوں بہن بھائی کے سرپرست تھے۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ بھلا جلال کو انکار کے بعد وہ بھی آمنہ کا رشتہ دیں گے؟

ایک..... دو..... تین ہفتے گزر گئے۔ جاوید کی تو بھوک پیاس اڑ ہی چکی تھی۔ ہم بھی فکر مند تھے۔ رمضان تیزی سے گزر رہا تھا اور آج کل میں جاوید کا رزلٹ بھی آنے والا تھا۔

ایک شام پتہ چلا کہ الفت درانی نے بزرگوں کو افطاری پر بلایا ہے۔ وہاں سے جو لوٹے تو سب ہی چپ چپ تھے۔ بہت سن گن لینے کی کوشش کی۔ نہ اسفندیار ہاتھ آیا' نہ عالیشان۔ حنی نے بھی ڈانٹ کر بھگا دیا اور علی بھی حجرے میں ہی سو گیا۔

کافی دیر تک ابی کے کمرے میں خفیہ اجلاس ہوتا رہا پھر مجھے طلب کیا گیا۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ثمیرا نے تو باقاعدہ مجھے آیت الکرسی پڑھ کر اندر جانے کو کہا۔

میں اندر گئی۔ ہر چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی۔ ہر چہرہ سپاٹ تھا۔ اقرار یا انکار؟ کسی بات کا بھی تو پتہ نہیں چل رہا تھا۔

میں نے پریشانی سے آغا جی کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے ڈرامائی انداز میں کھنکھارے اور آہستہ سے بولے۔ "تم ہی نے یہ بات کی تھی اور تم ہی جا کر جاوید کو بتاؤ' اب یہ رشتہ ہونا نہ ہونا اسی پر منحصر ہے۔"

"آپ کہیے تو سہی آغا جی!" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔

"آمنہ بچپن میں گھوڑے سے گر گئی تھی جس سے اس کا ذہنی توازن شدید متاثر ہوا۔ اس پر اکثر نابینائی کے دورے پڑتے رہتے ہیں۔ یعنی وقفوں سے اس کی بینائی کچھ عرصے کے لیے چلی جاتی ہے۔ یہ بات بڑی بات تو نہیں لیکن بہرحال ایک خامی ضرور ہے اور الفت نے ہمیں پہلے ہی اس سے آگاہ کر دیا ہے۔" آغا جی خاموش ہو گئے۔

مجھے معلوم تھا جاوید ہی نہیں' اس وقت سب ہی کمرے کے باہر میرے منتظر تھے۔

میں اٹھی ہی تھی کہ سامنے دروازے میں جاوید نظر آیا' وہ بے حد سنجیدہ تھا اور اس کے چہرے سے بردباری ٹپک رہی تھی۔

"مجھے آمنہ ہر خامی سمیت قبول ہے آغا جی۔" کمرے کے سکوت میں اس کی آواز گونجی۔

"ہرے۔" میں نے بے اختیار کہا۔ سب نے گھور کر مجھے دیکھا۔

جاوید واپس جا چکا تھا۔ میں بھی تیر کی طرح باہر لپکی۔ جہاں سب جاوید کو گھیرے کھڑے تھے۔

"گستہ دی گریٹ۔" اس نے مجھے دیکھ کر نعرہ لگایا' اور بھاگ کر میرے گلے آلگا۔

"مبارک ہو جاوید! تم اتنے خوش قسمت نکلے۔" میں نے کہا۔

"سب تمہاری وجہ سے ہوا گستہ!" جاوید بولا۔

"کرٹ والڈ ہائم کی وجہ سے۔" گل مہر نے ٹکڑا لگایا۔

اس لمحے جاوید کا ماتھا چومتے ہوئے بے شمار چہرے میری نظروں میں گھوم گئے جو اس لمحے کی خوشی سے محروم رہے تھے اور ان میں میرا اپنا چہرہ بھی شامل تھا۔